رسائل و مسائل

اسلامی حکومت میں متعصب مستشرقین کے افکار کی اشاعت

سوال: کیا اسلامی ملک میں ان مغربی مستشرقین غیر مسلم اسکالرز اور پروفیسروں کو تعلیم یا تقریر کے لیے مدعو کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہوتے نہ صرف اسلام پر بے جا تنقیدی تبصرے کیے ہیں بلکہ عمداً یا کم علمی و تعصب سے اسلامی تاریخ لکھنے میں حضور اکرمؐ، اہلِ بیت، خلفائے راشدین، صحابۂ کرام و ائمۂ کرام (جن پر اسلام اور مسلمانوں کو فخر ہے) کی شان میں نازیبا فقرات لکھ کر ہدفِ ملامت بنایا ہے؟ مثلاً امریکی و برطانوی قابل ترین پروفیسروں کی نظر ثانی شدہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی دیگر اعتراضات کے علاوہ رسول مقبولؐ کی ازواجِ مطہرات کو CONCUBINES (لونڈیاں) لکھا ہے۔ ان میں سے اکثر کے یہاں آکر لکچر اور خطبات دینے اور ان کی تشہیر کرنے پر کیا اسلامی حکومت بالکل پابندی عائد نہ کر دیگی؟ یا ان کتابوں اور زہر آلودہ لٹریچر کی ہماری لائبریریوں میں موجودگی گوارا کی جا سکتی ہے؟ حکومت ان کے جوابات و تردید شائع کرنے ان کی تصحیح کرانے یا ان سے رجوع کرانے کے لیے کیا اقدام کر سکتی ہے؟

جواب:- یہ زمانے کے انقلابات ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ یورپ کے عیسائی اندلس (SPAIN) جا کر مسلمانوں سے انجیل کا سبق لیا کرتے تھے۔ اب معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے کہ مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے۔ حتیٰ کہ عربی زبان بھی مغربی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے، مغربی ممالک سے استاد درآمد کر کے ان سے

اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں نہ صرف اسے پڑھا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی رائے کو ذرہ برابر بھی دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہودیوں نے اپنی انسائیکلوپیڈیا (JEWISH ENCYLCOPAEDIA) شائع کی ہے اور اس میں کوئی ایک مضمون (ARTICLE) بھی کسی مسلمان تو درکنار کسی عیسائی مصنف کا بھی نہیں ہے۔ بائیبل کا ترجمہ بھی یہودیوں نے اپنا کیا ہے۔ عیسائیوں کے ترجمے کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس کے برعکس یہودی مصنفین اسلام کے متعلق مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں اور مسلمان ہاتھوں ہاتھ ان کو لیتے ہیں اور ان کا یہ حق مانتے ہیں کہ ہمارے مذہب اور ہماری فقہ اور ہماری تہذیب اور ہمارے بزرگوں کی تاریخ کے متعلق وہ محققانہ کلام فرمائیں اور ہم یہ چیزیں ان سے سیکھیں۔ یہ صورت حال کسی صحیح اسلامی حکومت میں نہیں رہ سکتی اور نہ رہنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ رہ سکے۔ اسلامی حکومت بھی ہو اور اسلام اور مسلمان یتیم بھی ہوں، یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت ہی کو مبارک رہے۔

غیر مسلم ممالک سے اقتصادی اور صنعتی قرضے

سوال۔ کیا اسلامی حکومت موجودہ دور میں جبکہ ایک ملک دوسرے ملک سے قطع تعلق کر کے ترقی نہیں کر سکتا، غیر ممالک سے مطلق اقتصادی، فوجی، ٹیکنیکل امداد یا بین الاقوامی بینک سے شرح سود پر قرض لینا بالکل حرام قرار دیگی؟ پھر مادی صنعتی زراعتی و سائنسی ترقی وغیرہ کی جو عظیم خلیج مغربی ترقی یافتہ (ADVANCED) ممالک اور مشرق وسطی بالخصوص اسلامی ممالک یا اس ایٹمی دور میں HAVE اور HAVE NOT کے درمیان حائل ہے کس طرح پر ہو سکے گی؟ نیز کیا اندرون ملک تمام بینکنگ

انشورنس سسٹم ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا؟ سود، پگڑی، منافع و ربح اور گڈول (GOODWILL) اور خرید و فروخت میں دلالی و کمیشن کے لیے کونسی اجتہادی راہ نکالی جا سکتی ہے؟ کیا اسلامی ممالک آپس میں سود، منافع، ربح وغیرہ پر کسی صورت میں قرض لین دین کر سکتے ہیں؟

جواب - اسلامی حکومت نے کسی دور میں بھی غیر مسلم ممالک سے قطع تعلق کی پالیسی اختیار نہیں کی اور نہ آج کرے گی لیکن تعلق کے معنی قرض مانگتے پھرنے کے نہیں ہیں، اور وہ بھی اُن کی شرائط پر۔ یہ تعلق اِس زمانے کے کم ہمت لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے۔ اگر کسی ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ مادی ترقی سے پہلے اپنی قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرے گی۔ اخلاقی حالت سدھرنے کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے حکمران اور اس کی انتظامی مشینری کے کارپرداز اور قوم کے افراد ایماندار ہوں۔ اپنے حقوق سے پہلے اپنے فرائض کو ملحوظ رکھنے اور سمجھنے والے ہوں۔ اور سب کے سامنے ایک بلند نصب العین ہو جس کے لیے جان، مال اور وقت اور محنتیں اور قابلیتیں سب کچھ قربان کرنے کے لیے وہ تیار ہوں۔ نیز یہ کہ حکمرانوں کو قوم پر اور قوم کو حکمرانوں پر پورا اعتماد ہو اور قوم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھے کہ اس کے سربراہ درحقیقت اس کی فلاح کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال اگر پیدا ہو جائے تو ایک قوم کو باہر سے سود پر قرض مانگنے کی صورت پیش نہیں آ سکتی۔ ملک کے اندر جو ٹیکس لگائے جائیں گے وہ سو فیصدی وصول ہوں گے اور سو فیصدی ہی وہ قوم کی ترقی پر صرف ہوں گے۔ نہ ان کی وصولیابی میں بے ایمانی ہوگی اور نہ ان کے خرچ میں ہی بے ایمانی ہوگی۔ اس پر بھی اگر قرض کی ضرورت پیش آئے تو قوم خود سرمایہ کا ایک بڑا حصہ رضاکارانہ چندے کی صورت میں اور ایک اچھا خاصہ حصہ غیر سودی قرض کی صورت میں اور ایک حصہ منافع میں شرکت کے اصول پر فراہم کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی اصولوں کا تجربہ کیا جائے تو شاید بہت جلدی پاکستان

دوسروں سے قرض لینے کے بجائے دوسروں کو قرضہ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

بالفرض اگر ہمیں بیرونی قوموں سے سُود پر قرض لینے کی کوئی ناگزیر صورت پیش آہی جائے، یعنی ہمیں اپنی ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم ہو اور اس کے لیے ملک میں سرمایہ بھی نہ مل سکے، تو دوسروں سے سُود پر قرض لیا جا سکتا ہے لیکن ملک کے اندر سودی لین دین جاری رکھنے کا پھر بھی کوئی جواز نہیں۔ ملک میں سود بند کیا جا سکتا ہے اور پورا مالی نظام (FINANCIAL SYSTEM) سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے۔ میں اپنی کتاب "سود" میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ بینکنگ کا نظام سُود کے بجائے منافع میں شرکت (PROFIT SHARING) کے اصول پر چلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انشورنس کے نظام میں ایسی ترمیمات کی جا سکتی ہیں جن سے انشورنس کے سارے فوائد غیر اسلامی طریقے اختیار کیے بغیر حاصل ہو سکیں۔ دلالی منافع، پگڑی، کمیشن یا گڈ ول (GOOD WILL) وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ شرعی پوزیشن ہے۔ جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئیگا تو اس کا جائزہ لے کر یا تو سابق پوزیشن بحال رکھی جائے گی یا پھر ضروری اصلاحات کی جائیں گی۔

نظامِ عدل میں تغیّرات اور اُن کی نوعیت

سوال۔ اس برِّ صغیر میں چونکہ تمام قانونی ضابطہ ہائے دیوانی، فوجداری، مالیاتی اور عملدرآمد کے قوانین (PROCEDURAL LAW) وغیرہ عرصہ سے ہر عدالت میں جاری و ساری ہیں، اور چونکہ ڈیڑھ صدی سے تمام لوگ بالخصوص جج و وکلاء وغیرہ نہ صرف ان قوانین سے پوری طرح مانوس بلکہ اس کا وسیع علم رکھتے ہیں، اس لیے بھی اسلامی مملکت کے قیام سے یہاں برطانوی دور کے نظامِ عدل

(BRITISH RULE OF LAW) کا سارا ڈھانچہ بدلنا ممکن نہ ہوگا۔ تو کیا پھر بھی عدالتی ریفارم لائی جائیں گی جبکہ اسلامی قانون کسی پہلو سے جامع، مرتب یا مکمل اور مدوّن (CODIFIED) نہیں ہے؟ اسلامی عدالتی نظام میں وکلا کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسی طرح PROCEDURAL LAW کے تحت انہیں مقدمہ جات لڑنے اور مقدمہ بازی (LITIGATION) کو طول دینے کا اختیار ہوگا؟ کیا اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے کی سزائیں دی جائیں گی؟ اور کیا قاضیوں کو قانونِ شہادت (EVIDENCE LAW) کی مدد کے بغیر فیصلے صادر کرنے ہونگے؟ پھر بین الاقوامی قسم کے ادارے مثلاً اقوام متحدہ (UNITED NATIONS) کی جنرل اسمبلی، سیکورٹی کونسل، بین الاقوامی عدالتِ انصاف یا کمرشل ٹریبونل اور لیبر قوانین وغیرہ کی عمل داری و دخل اندازی یا انٹرنیشنل لا پر عمل پیرا ہونے اور ان کی من وعن قبولیت کے لیے اسلامی حکومت کا کیا رویہ ہوگا؟ اگر اسی قسم کے ادارے اسلامی کنفیڈریشن یا اسلامی بلاک بنا کر عمل میں لائے جائیں تو ان کو کیا حیثیت حاصل ہوگی؟ کیا اسلامی قانون ساز اسمبلی کے پاس شدہ یا اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ کو نظرِ ثانی (REVIEW) کرنے کا اختیار ہوگا؟ اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات کس طرح رفع کیے جا سکتے ہیں؟

جواب۔ اس سوال کے جواب میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے کہ جب انگریزی حکومت اس ملک میں آئی تھی تو اس وقت سارا قانونی نظام (LEGAL SYSTEM) اسلامی فقہ پر قائم تھا۔ انگریزوں نے آکر اس کو یک لخت تبدیل نہیں کیا بلکہ انگریزی حکومت میں سالہا سال تک اسلامی نظامِ قانون ہی چلتا رہا۔ انگریز اس کو بتدریج تبدیل کرتے رہے اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنا نظام رائج کیا۔ اب اگر ہم اسلامی نظامِ قانون

کو از سر نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، بتدریج ہی ہوگی اور اس کے لیے بہت حکمت کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا پڑے گا۔ اسلامی قوانین اگر مدوّن (CODIFIED) نہیں ہیں تو ان کے مدوّن (CODIFY) کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کی شرحیں کثرت سے موجود ہیں، ان کو آسانی سے اردو زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور آگے نئی شرحوں کا سلسلہ چل سکتا ہے۔

اسی موجودہ ترقی یافتہ دور میں سعودی عرب میں زنا اور چوری کی سزائیں جاری ہیں اور تجربے نے تمام دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہی سزاؤں کی وجہ سے سعودی عرب میں جرائم کی اتنی کمی ہو گئی ہے جتنی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ اب اگر اس دور کے ترقی یافتہ ہونے کے معنی یہی ہیں کہ جرائم میں ترقی ہو تو مغربی قانونی سسٹم پر شوق سے عمل کرتے رہیے لیکن جرائم کا انسداد بھی اگر ترقی کے لیے ضروری ہے تو پھر یہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کارگر کوئی قانون نہیں ہے۔ دراصل اس زمانے کی لادینی تہذیب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرموں کے ساتھ ہیں۔ اسی لیے یہ نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ چوری کرنا کوئی وحشیانہ کام نہیں ہے، البتہ اس پر ہاتھ کاٹنا وحشیانہ کام ہے۔ اور زنا کا ارتکاب تو مغربی تہذیب میں ایک تفریح ہے ہی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس خیال کا ماخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون میں قاضیوں کو قانونِ شہادت (EVIDENCE) کی مدد کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے یا کوئی ایسا دستور العمل رہا ہے۔ حالانکہ خود قرآن نے قانونِ شہادت کے بہت سے اصول بیان کیے ہیں اور اس کی بیشتر تشریحات حدیث اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے ملتی ہیں۔ بالخصوص فقہاء نے ان اصولوں کو نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے اور اسلامی دور میں کوئی ایسا قاضی نہیں گزرا جس نے ثبوت کے بغیر فیصلے صادر کیے ہوں۔

وکالت کے بارے میں میرے نزدیک صرف اتنی اصلاح درکار ہے کہ قانون کی پریکٹس بند کر دی جائے اور وکلاء کو اسٹیٹ معاوضہ دے۔ اب بھی قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وکیل کا اصل کام اپنے موکل کی حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ عدالت کو قانون سمجھنے اور منطبق (APPLY) کرنے میں مدد دینا ہے۔ وکالت کے پیشہ بن جانے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ وکیل عدالت کو گمراہ (MISLEAD) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گواہوں کو سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ عدالت کے سامنے مقدمے کی رُوداد غلط لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقدمات کو طول بھی دیتے ہیں اور مقدمہ بازی کو بڑھاتے بھی ہیں۔

بین الاقوامی قسم کے تمام اداروں میں ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے اندر اگر کوئی چیز بھی ہمارے اصول کے مطابق نہ ہوگی تو ہم اس کی حد تک اپنی الگ پالیسی بنائیں گے اور اسی حد تک ہماری شرکت میں استثنا ہوگا۔ مسلمان ممالک خود اپنی دولت متحدہ (COMMON WEALTH) یا تحالف (CONFEDERATION) بنا سکتے ہیں اور اسلامی اصول کے مطابق باہمی تعلقات کے طریقے مقرر کر سکتے ہیں۔

اسلامی قانون ساز اسمبلی کے طے کیے ہوئے اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ نظرثانی (REVIEW) نہیں کر سکتی البتہ اگر وہ احکام قانون ساز اسمبلی کے اختیار سے متجاوز ہوں تو ان کو حدِ اختیار سے متجاوز قرار دے سکتی ہے۔

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات رفع کرنے کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ایمانداری کے ساتھ قرآن اور سنت کی ہدایات پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ قرآن کی تاویل اور سنت کی تحقیق میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن وہ مل کر کام کرنے میں مانع نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں کہ جو شخص بھی قرآن اور سنت کو سند و حجت (AUTHORITY) مانے اور حضور سرورِ کائنات کے بعد کسی دوسری نبوت کا قائل نہ ہو وہ ہماری برادری کا آدمی ہے تو یہ چیز کسی آدمی کو ہماری برادری سے خارج نہیں کر سکتی کہ وہ قرآن کے معنی کچھ مختلف سمجھ رہا ہے اور اس کے نزدیک کسی معاملہ میں سنت سے کوئی اور بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جتنی عدالتیں بھی پاکستان کے دستور اور قانون کو واجب الاطاعت قانون مان کر کام کرتی ہیں وہ سب اس ملک کی جائز عدالتیں ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام عدالتوں کے فیصلے بھی یکساں ہوں۔